DARYAFT: ISSN 2616-6038 (E), ISSN (P): 1814-2885
Volume 14, Issue 02, (Dec 2022): DOI # https://doi.org/10.52015/daryaft.v14i2.268

ڈاکٹر محمد ارشد (کامران)

ہائر ایجوکیشن کمیشن پی سی ڈی نمبر: S.No.22955 اسلام آباد۔

ہجرت کا تاریخی و ادبی منظر نامہ اور دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا

Dr. Muhammad Arshad (Kamran)

Higher Education Comission PCD # S.No 22955, Islamabad.

Historical and Literary Background of Migration and Devender Isar's Nostalgia

ABSTRACT

Expressing melancholy and emotional yearning of the past time, called Nostalgia is cause of people movement from homeland to other city, state, country or region, seeking for employment, education, political asylum, citizenship or persuading security in safer and less crimes places or safeguard from environmental disaster etc. is called migration which, since long, has resulted in manifold complications. As an immigrant, despite of forcedly bifurcating from his homeland for one reason or the other, he can never eradicate his past memories and deep attachments with motherland. Soon after the division of subcontinent, people of the area also left their origin to settle down in new country for safety and security but during crossing the durned line, brutal violence and pitiless massacres on both sides caused enormous killing of family members and abduction of young girls and women.

Keywords: *Nostalgic, Melancholy, Yearning, Migration, Massacres.*

آدم کی خلدِ بریں سے مادی دنیا کی سمت ہجرت نے نقل مکانی کی جس روایت کا آغاز کیا تھا وہی روایت مختلف پیغمبروں، مذاہب اور اقوام سے ہوتی ہوئی آج کے جدید دور میں بھی بر قرار ہے بلکہ انسان کے علاوہ چرند پرند بھی ہجرت کی اسی روایت پر عمل پیرا، شدتِ موسم سے بچاؤ اور خوراک کی تلاش میں سمندر تک عبور کر جاتے

Received: 10th Aug, 2022 | Accepted: 15th Dec, 2022 | Available Online: 30th Dec, 2022

DARYAFT, Department of Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad.
This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

ہیں۔کتاب اللہ میں تخلیقِ انسان سے متعلق آگاہی دلائی گئی ہے کہ "خَلَقَ الاِنسَانَ مِن صَلصَالٍ کَا لفَخَّار" 'ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا'، چنانچہ اپنے تخلیقی عمل کی تکمیل کے بعد انسان اسی مٹی میں سے ہی اپنے رزق کی تلاش میں سرگرم رہا ہے جس کے لیے اسے فکرِ معاش اور حفظِ جان کی خاطر ہجرت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ ہجرت کی آدم تا ایں دم، قائم یہ رِیت تا قیامت برقرار رہے گی تاہم ہجرت بصورتِ جبر اختیار کرنے سے ماضی کی یادیں انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتیں اور وہ عمر بھر جنم بھومی سے جدائی کے کربناک انگاروں پر لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں محمد امان اللہ خان کے ذیل کے اقتباس میں نہاں فرقتِ وطن کے کرب کی عکاسی قابلِ غور ہے:

> "انسان وقت کے دھارے میں بہتا نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا... کبھی اجنبی دیسوں میں بیگانہ ہوا کبھی ان بستیوں کو اپنا لیا... خانہ بدوشی، نقل مکانی، جلاوطنی، شجرِ ممنوعہ، یا شہرِ تمنا، ارضِ موعودہ یا جنتِ گم گشتہ کی تلاش، کبھی خوشی کی تلاش تو کبھی سکون کے حصول کے لیے بار بار اپنی زمین، اپنے ماضی، اپنی بنیادوں سے علیحدہ، ہو کر ماضی اور زمین کی یادیں وطن کے روپ میں ذہن میں بسا کر درد و غم سمیٹتے ہوئے وقت کے دھارے میں بہتا چلا گیا۔"(۱)

ہجرت کا تاریخی منظر نامہ

آج کے جدید دور میں جس طرح انسان کبھی ذاتی خواہشات تو کبھی ضروریاتِ حیات کی تکمیل یا پھر جنگ و جدل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھی ہجرت کی راہ اپنانے کی روایت بہ آسانی اختیار کر لیتا ہے جس سے نقل مکانی کا سلسلہ بھی آئے روز وسعت پذیری اختیار کرتا جا رہا ہے، کسی زمانے میں انسان کے لیے گاؤں سے شہر میں بسنا بھی مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کے مقابل اب تو متقلیئ سکونت کے سلسلے کی کڑیاں شہر سے شہر کے علاوہ ملکوں ملک، بلکہ برّاعظم سے برّاعظم جا ملی ہیں نتیجتاً نقل مکانی کی وسعت پذیری نے عالمی امن کو بھی شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ تاریخی تناظر میں بیسویں صدی کو ہجر و الم کی صدی کہنا اس لیے بھی بے جا نہیں ہے کہ محض ۱۸۲۱ء سے ۱۹۲۴ء کے دورانیے میں ساڑھے پانچ کروڑ سے زائد لوگ سمندر پار نقل مکانی پر مجبور ہوئے تھے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء کے دورانیے میں روس میں سفید اور سرخوں کی خانہ جنگی کے نتیجے میں دس لاکھ روسی ہجرت پر مجبور ہوئے۔ برطانوی نو آبادیات کے زمانے سے مختلف ممالک کے مکینوں کی امریکہ نقل مکانی کا سلسلہ آج بھی زور و شور سے جاری ہے۔ اسی طرح جرمن کی برازیل میں آبادکاری کا آغاز ۱۸۲۴ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جرمنی میں یہودیوں کے خلاف فسادات نے نہ صرف ان کی نقل مکانی کو فروغ دیا بلکہ مشرقی اور مغربی جرمنی کی سرحدی تقسیم اور اشتراکی حکومت کے قیام

سے لوگوں کی مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی کی جانب منتقلی کا سلسلہ زور شور سے پھیلتا چلا گیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد صرف یورپ میں ۱۵/ ملین جرمن افراد، جرمنی کی سرحدوں سے باہر جا بسے تھے۔ نقل مکانی کی یہی روایت ۱۹۴۹ء میں ۸/ لاکھ افراد کی ہجرت سے مزید توانا ہوگئی۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں بھی تقریباً ۴۸/ لاکھ سے زائد افریقی باشندے امریکہ کی مختلف ریاستوں کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔ یونان کے باشندوں نے ۱۸۲۹ء کے بعد دوسری بار بھی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیانی عرصہ میں آسٹریلیا کی ہجرت کو معمول بنالیا بلکہ یونان نے از خود بھی پچاس ہزار ترک، سمرنا اور ایشائے کوچک کی جانب دھکیل دیے تھے۔ اکیسویں صدی کے آغاز ۲۰۱۵ء سے افریقی اور ایشیائی ممالک کے تارکینِ وطن ہجرت کی نئی راہیں تلاش کرتے ہوئے، یورپ، کینیڈا اور امریکہ میں ورود کے لیے اسپین اور اٹلی کی راہ اپنانے کی بجائے یونان کا راستہ اختیار کرنے کو فوقیت دینے لگے ہیں۔ اسی طرح خانہ جنگی کے نتیجے میں بوسنیا کے مسلمانوں کی مختلف ممالک کی جانب ہجرت اور افغانستان میں روس اور امریکہ کی دخل در اندازی کے نتیجے میں بپا خانہ جنگی کے دوران، افغان باشندوں کی مختلف ممالک کو ہجرت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

امریکہ اور یورپی ممالک کو نقل مکانی کے علاوہ برّصغیر پاک و ہند کا خطہ بھی حملہ آوروں کی تاریخ کے حوالے سے خاصا مشہور رہا ہے جو یہاں کے باسیوں کے لیے ترکِ سکونت و ہجرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سب سے قدیم نسل دراوڑ قوم کے مغربی ایشیا سے آکر یہاں قدم جمانے کے بعد اسی بھیڑ چال میں ایرانی النسل آریاؤں کا بھی ورود ہوا۔ مہابھارت جنگ کے بعد آریاؤں کا عمل دخل ختم ہونے کے ساتھ ہی عرب، ترک اور ایرانی النسل اقوام بھی اس علاقے میں داخل ہونے لگیں مگر اپنے طویل دورِ حکومت کے باوجود بھی انھوں نے اپنے ماضی کے مسکن سے رشتہ استوار رکھا۔ اسی ناسٹیلجیا کا شکار ہونے پر یہ اقوام، نسل در نسل یہاں بسنے کے باوجود بھی اپنی اصل شناخت پر قائم رہتے ہوئے آج بھی خود کو شیرازی، اصفہانی، افغانی، ایرانی اور ترکی کہلانے پر نازاں ہیں۔ مسلم فاتحین اور صوفیائے کرام کی تقلید میں انگریز سامراج بھی پہلے پہل تجارت کی غرض سے ۱۶۰۳ء میں یہاں آئے مگر بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی چالوں اور منافقانہ حربوں کے بل بوتے پر مغل حکمرانوں کی شہنشایت نیست و نابود کرتے ہوئے باقاعدہ تخت پر قابض ہوگئی تھی جس کے خلاف برِّصغیر پاک و ہند کے باسیوں میں غیض و غضب کے جذبات کا پنپنا فطری عمل تھا، جس کا اظہار ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پر کیا گیا مگر جواب میں انگریز سامراج بھی برّصغیر پر مکمل کنٹرول کے بعد بدلہ لینے پر اتر آیا۔ انگریزوں کی جانب سے تقریباً ایک صدی کے طویل دورانیے کے بعد ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کی برّصغیر سے واپسی کی نوید سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد نے بھارت سے پاکستان نقل کی۔ شومئ قسمت کہ آزادی کی خوشیوں کے چراغ ابھی روشن بھی نہ ہو پائے تھے کہ انگریز سامراج کی سازش و طبقاتی

منافرت، مذہبی جنون، سرحد کی دونوں جانب پروان چڑھتے نفرت انگیز روّیے اور سب سے بڑھ کر نام نہاد لیڈروں کی نا اہلی کے رنگ لانے پر مسلم، سکھ اور ہندوؤں کے دلوں میں پنپنے والی منافرت کی دراڑیں خون کی ہولی پر منتج ہوئیں۔ بچے کھچے مہاجرین، نئے دیس میں پہنچ کر بھی سکھ کا سانس لینے کی بجائے اپنی آنکھوں کے سامنے نہ صرف بہو، بیٹیوں کی عصمتیں لٹتی دیکھتے رہے بلکہ کم و بیش پانچ لاکھ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے قتل کے اندوہناک واقعات کے صدمات ان کے قلب و ذہن سے باہر نکال ہی نہ پائے۔ یوں تو دل و دماغ پر چھائے درد و الم کے جوار بھاٹا کی شدت کا ازالہ کسی حد تک اپنے کرب کے اظہار سے ہو ہی جاتا ہے مگر ان مہاجرین کو اپنے آبائی مسکن کی مٹی کی مہک، شہر اور گلیوں میں کھیل کود کر گزری بچپن کی حسیں یادیں، شکستہ خواب، نئے وطن کے اجنبی ماحول میں آبادکاری جیسے مسائل نے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ نقل مکانی کا عمل محض جسمانی سفر تک محدود نہیں ہوا کرتا بلکہ ہجرت میں جسمانی سفر کے آغاز کے بعد یادِ وطن کا عارضہ اور ماضی کی حسرت ناک یادوں کا ناگ انسانی ذہنوں کو ڈستے ہوئے انھیں ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہمارے صاحبِ بصیرت اہلِ قلم برادری کے شاعروں، ناول اور افسانہ نگاروں کے ساتھ بھی پیش آیا اور اکثر افسانہ نگار بذاتِ خود ہجرت کے قافلے میں شامل رہے ہیں جو دورانِ ہجرت وقوع پذیر متعدد خون آشام واقعات کے چشم دید گواہ بھی رہے ہیں۔ انہی کی بدولت اردو افسانے کو نت نئے موضوعات میسّر آئے جس سے ناول کے بالمقابل اردو افسانہ بھی نئی کروٹیں بدلتا جلاوطنی کے کرب میں ڈوبنے لگا۔ اسی قبیل کے خونی واقعات کے چشمِ دید گواہ نند کشور وکرم، اپنے ریل کے سفر کی کتھا ذیل کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "تقسیم سے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں نے دیکھی ہیں اور میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں نے ہندوؤں کو بھی مرتے دیکھا ہے اور مسلمانوں کو بھی۔ میں امبالہ میٹرک کا امتحان دینے آیا تھا میرے ساتھی نے شلوار پہنی ہوئی تھی اس لیے ہم بھی شک کے دائرے میں آ گئے اور کپڑے اتروا کر ہماری شناخت کی گئی۔ ہمارے پاس ہی داڑھی والا مسلمان بیٹھا تھا، اسے تلوار سے مار کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ آج تک وہ چیخیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میں نے اپنے ناول انیسواں ادھیائے میں ایک باب کا عنوان ہی 'ریپ آف راولپنڈی' رکھا ہے۔"(۲)

نقل مکانی اور جلاوطنی کی اقسام میں سیاسی وجوہات کی بناء پر کی گئی جلاوطنی، ماحول کی ناآسودگی کی بناء پر کی جانے والی جلاوطنی، خارجی جلاوطنی، داخلی جلاوطنی اور خود اختیاری جلاوطنی وغیرہ شامل ہیں۔(۳) کسی ملک کے باسیوں کو ان کی جائے پیدائش سے زبردستی، سیاسی، معاشی یا معاشرتی دباؤ کے تحت جدا کرنا ہجرت کہلاتا ہے البتہ خانہ جنگی

سے پناہ لینے کے لیے اختیار کردہ ہجرت، جبری جلاوطنی کے زمرے میں آتی ہے۔ ہجرت کی قبیل کوئی بھی ہو، ہجرت کے کربناک احساس میں ڈوبا جلاوطن مسافر، اجنبی دیس کے اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبوری کے باوجود بھی شعوری یا غیر شعور طور پر اپنی جڑیں اجنبی دیس میں ہرگز پیوست نہیں کرنا چاہتا اسی لیے تادمِ آخر، وطن سے جڑی ماضی کی ہر یاد، وہ سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ بچھڑے ماضی کے نشے میں چُور دیویندر اسّر کے فن پاروں میں بھی ناسٹلجیائی عنصر کی بازگشت کے علاوہ فرقتِ وطن کی یاد کا رنگ متعدد ادیبوں کے ہاں بھی عکس انداز ہوا ہے۔ دیویندر اسّر کی تخلیقات میں اس رنگ کی تلاش سے قبل ہجرت سے متعلق ادبی منظر نامے پر نگاہ ڈالنا بھی مفید رہے گا۔

ہجرت کا ادبی منظر نامہ

جس طرح ہر عمل کے منفی اور مثبت دو پہلو ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہجرت کے المیے کے دیگر منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ماضی کی حسین یادوں کا مثبت پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا ہے اور فرقتِ وطن کے کرب (Nostalgia) کی بدولت عالمی ادبی افق پر اعلیٰ پائے کی فکری و ادبی تخلیقات ابھر کر سامنے آئیں جن میں پولینڈ کے سال بیلو اور آئزک سنگر جیسے تخلیق کاروں کا ناول 'جنت گم گشتہ'، البیر کامیو کی تخلیق 'اجنبی'، ہرمن ہیسے کی 'سدھارتھا'، فلسطینی شاعر محمود درویش کی نظم 'ڈینوب نیلا نہیں ہے' اور عرب تخلیق کار خلیل جبران اور دیگر ادباء کی 'ادب المہجر' (ہجرت کے دیس کا ادب یا پردیسی شاعری)' اور انڈونیشیا کے ناول نگار پرمودیہ آنند طور کا ناول 'دھرتی کے دکھ' جیسے ادبی شہپارے شامل ہیں۔ عالمی ادب کی پیروی میں اردو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پایا، چنانچہ برّصغیر کے نامور ادیبوں شاعروں اور ناول نگاروں نے بھی طویل عرصہ تک ہجرت اور جلاوطنی سے متعلق موضوعات قلمبند کرتے ہوئے اپنے احساس کی توانائیاں تابندہ رکھیں۔ خصوصاً افسانہ نگار جب ذاتی تجربات کے پسِ منظر میں اپنے خیالات و تجربات کا رنگ افسانوی کینوس پر، جذباتی انداز میں بکھیرتا ہے تو ادب کا قاری، افسانہ نگار کے تیکنیکی، اسلوبیاتی و فکری تجربات اور جذبات کے ورتارے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہندوستانی ادب کے ناول کے پسِ منظر میں کالی داس کے شاہکار 'شکنتلا' انشاء کی 'رانی کیتکی کی کہانی'، حیدر بخش حیدری کی 'آرائشِ محفل' سے شروع ہونے والے وطن سے جدائی کے کرب (ناسٹیلجیا) کا ادبی تسلسل میر امن کی 'باغ و بہار میں' دہلوی تہذیب کے ماحول کی عکاسی سے ہوا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کے جلاوطنی میں مرتبہ 'فسانۂ عجائب' سے بھی ناسٹلجیائی عنصر بخوبی عکس انداز ہوا ہے۔ عام حالات میں وقت کا گزر تا لمحہ، عموماً بطور مرہم پرانے زخم مندمل کر دیتا ہے جس سے درد و الم کی شدت میں کسی حد تک کمی آجاتی ہے مگر پھر بھی انسان اپنے پیدائشی وطن کے شہر، محلے، گلیاں، گھر اور صحن بھلا کہاں بھول سکتا ہے۔ نتیجتاً ترکِ سکونت اختیار کرنے والوں کے اذہان پر چمگادڑ کی طرح چپکی وطن سے محبت کی یادیں عمر بھر زندہ و توانا رہتی ہیں۔ قرۃ العین

حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کا ناسٹلجیائی عکس، فرقتِ وطن کی یادوں پر مبنی انتظار حسین کے ناول 'آگے سمندر ہے'، عبداللہ حسین کے 'اداس نسلیں' اور خدیجہ مستور کے 'آنگن' کے عنوان پر مرتبہ ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔ جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے تو اردو ادب کی کم و بیش دو سو سالہ تاریخ میں ۱۹۰۸ء سے قبل مختصر افسانے کی باقاعدہ شکل نہیں ملتی لیکن پریم چند بطور 'ادب برائے زندگی' کے پیروکار نے جب افسانوی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسندی کے نئے رنگ اس حد تک ابھر آئے کہ انگریز حکومت نے ان کے مجموعے 'سوزِ وطن' کی تمام کاپیاں ضبطگی کے ساتھ ہی نذرِ آتش کر دیں مگر اب راہِ طلب کے اس اکیلے مسافر کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک 'رومانوی افسانہ نگاروں' کا اچھا خاصہ ایسا گروہ پیدا ہو چکا تھا جو زبان و بیاں کی خوبصورتی نکھارنے میں حقیقی مسائل سے اجتناب برتتے ہوئے خیالات و تصورات کے تانے بانے بننے لگا تھا جس کے سرخیلوں میں پریم چند (شروع کے دور میں) سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور اور حجاب اسمٰعیل وغیرہ شامل تھے۔ ان میں پریم چند اس لیے نمایاں ہیں کہ انھوں نے پہلی بار کامل ادراک سے عوامی مسائل مؤثر انداز میں پیش کیے ہیں۔ ماضی کی یاد میں ڈوبے، مستقبل کی فکر میں مبتلا افسانہ نگار، اپنے فن پاروں میں ہجرت کے صدمات، اور پیدائشی وطن سے جدائی کی یادیں، بطور کربناک المیہ ابھار کر سامنے لائے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھانے والے افسانہ نگاروں کی کثیر تعداد سرحد کے دونوں جانب ہجرت کرنے والوں پر مشتمل تھی یہی وجہ ہے کہ ماضی کی باز آفرینی (ناسٹیلجیا) کی جھلک ان کے فن پاروں میں رقصاں نظر آتی ہے۔

متعدد افسانہ نگاروں کے ہاں ہجرت کے موضوعات پر مبنی فن پاروں میں اجاگر کی گئیں جلاوطنی کی مختلف نوعیتوں کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد افسانوی ادب میں جبری جلاوطنی سے بیدار ہونے والی ذہنی جلاوطنی کا عکس سعادت حسن خان منٹو کے افسانے 'کھول دو'، جمیلہ ہاشمی کے 'بن باس'، رامانند کے افسانے 'بھاگ ان بردہ فروشوں سے' عصمت چغتائی کے 'جڑیں' اور احمد ندیم قاسمی کے 'گڈریا' میں نمایاں ہوا ہے۔ غلام عباس کے افسانوں میں جسمانی و ذہنی جلاوطنی کے پسِ منظر میں ذات اور ماحول کا باہمی موازنہ پیش ہوا ہے۔ عبداللہ حسین کے 'مہاجرین' کے عنوان سے افسانے میں خود ساختہ جلاوطنی کے پسِ منظر میں جنم لینے والی نئی تہذیبی و ذہنی جلاوطنی کا موضوع اور 'ندی' افسانے میں تہذیبی و نفسیاتی جلاوطنی کا عنصر اجاگر ہوا ہے۔ ان کے 'سمندر' کے عنوان پر مبنی افسانے میں ارضی و نفسیاتی مسائل اور 'دھوپ' میں جسمانی، ذہنی، اور روحانی جلاوطنی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ جلاوطنی اور احساسِ تنہائی کا کرب ان کے افسانے 'جلاوطن' میں بھی کھل کر بیان ہوا ہے۔ رام لعل کے 'اکھڑے ہوئے لوگ'، 'نئی دھرتی پرانے گیت' اور 'ایک شہری پاکستان کا' عنوان پر مبنی افسانوں کے علاوہ 'قبر' افسانے میں بھی

جسمانی، ذہنی اور روحانی جلاوطنی کے موضوعات اجاگر ہوئے ہیں۔ خود ساختہ اور جبری جلاوطنی پر مشتمل جغرافیائی، تہذیبی، ذہنی، جسمانی اور روحانی جلاوطنی جیسے موضوعات کا عنصر نمایاں کرنے والے افسانوں میں جوگندر پال کے 'باشندے' اور 'دریاؤں کی پیاس'، کنہیالال کپور کا 'ہندوستان دیکھیے'، امراؤ طارق کا 'دراڑوں میں سانپ' وغیرہ شامل ہیں۔ فرخندہ لودھی کے 'بوٹیاں' اور 'شباب: گھر کے راستے پر'، محمد اشرف کے 'ڈار سے بچھڑے'، شوکت حیات کے 'گھونسلا'، میں بھی جلاوطنی کا ناسٹلجیائی رنگ نمایاں ہوا ہے۔ ہمارے جن افسانہ نگاروں کو مشرقی پاکستان کے سانحے کی بدولت ہجرت کا ذائقہ دوسری بار بھی چکھنا پڑا، ان میں اختر جمال کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے اپنے دکھوں کی کہانی 'دوسری ہجرت' افسانے کی زبانی بیان کرتے ہوئے آبائی وطن سے محبت کی یاد کے چراغ جلائے ہیں۔ اسی طرح آصف فرخی کے 'یادوں کے پردیس' اور 'بیاہی بدیس'، سمیعہ نعمت کے 'آزادی کے بعد' اور فاطمہ حسن کے 'زمین حکایت' وغیرہ کا شمار بھی اسی قبیل کے افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔

ادبی منظر نامے میں ہجرت کے تکلیف دہ سفر میں ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر عورت ہی بنی رہی ہے جسے نہ صرف غیروں کے ظلم و ستم اور جنسی استحصال کے وار سہنے پڑے بلکہ عزت لٹ جانے کے بعد اسے عموماً اپنوں کی بے مروتی بھی لے ڈوبی تھی۔ عورتوں کے ساتھ روا ظلم و ستم کی المناک داستان سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے 'کھول دو' میں سکینہ کے کردار میں پیش کی ہے۔ قدرت اللہ شہاب بھی 'یاخدا' افسانے میں عورت کا یہی المیہ پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نوعیت کے کربناک تجربات جمیل ہاشمی کے افسانے 'بن ماس' اور خدیجہ مستور کے 'مینوں لے چلے بابلا' میں بھی نمایاں انداز میں پیش ہوئے ہیں۔ جس طرح جلاوطنی اور ہجرت کے احساسات معروف ناول نگاروں کے ہاں اجاگر ہوئے ہیں ناسٹیلجیا کا وہی کرب بطور حساس دل افسانہ نگار، قرۃ العین حیدر کے اعصاب پر بھی سوار رہا جو اپنے متعدد افسانوں میں کہیں نمایاں تو کہیں بین السطور میں اپنے جذبات منعکس کرنے میں اس لیے بھی کامیاب رہی ہیں کہ انھیں بھی بذاتِ خود ہجرت کے تیر کا نشانہ دو بار بننا پڑا تھا۔ چونکہ ان میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی حس مفقود تھی اسی لیے انھوں نے لاہور آکر یہاں بسنے کی کوشش ضرور کی مگر پھر ماحول سے بیزار ہو کر دوبارہ بھارت پلٹ گئیں۔ ان کے خیال میں ہجرت کے بعد خاندانوں کے بکھراؤ نے بے اختیاری اور بے اعتباری کو جنم دے کر برّصغیر کو دو ملکوں میں ہی تقسیم نہیں کیا بلکہ انسان کی اپنی شخصیت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی جسے ملکی بٹوارے کی بجائے انسانی شخصیت کے بٹوارے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ ہجرت کے صدمات کا کرب جن افسانہ نگاروں کی پہچان بنا، ان کے سرخیل انتظار حسین ہی تھے جنھیں بذاتِ خود ملکی تقسیم سے نفرت کی دیواریں کھڑی ہونے کے بعد ماضی کی یادیں بھلانے میں ذہنی کرب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انتظار حسین چونکہ ماضی کی گم شدہ روایات کی تلاش میں سرگرداں، یادِ

ماضی کے کرب کا داغ مٹانے کی کوشش میں مگن رہے ہیں اسی لیے انھیں ناقدین سے ناسٹلجیا کا شکار ہونے کے طعنے بھی سننے پڑے۔ انتظار حسین کے متعدد افسانے کبھی تو قاری کو اپنے ساتھ پیچھے رہ جانے والے محلے اور بازاروں میں لے جاتے ہیں تو کبھی 'مشکوک لوگ' افسانے کے کردار کے روپ میں، لاہور کے گلی محلوں میں گڑ اور گجک کی لذت تلاش کرتے نظر آتے ہیں تاہم ان کے ہاں ناسٹلجیا، کرب وانبساط کی مخلوط شکل میں سامنے آیا ہے۔

اشفاق احمد اپنے دور کے متعدد افسانہ نگاروں کی طرح تقسیم، ہجرت، دورانِ ہجرت قتل و غارت کے اندوہناک واقعات اور ماضی کی یادوں کے حصار میں گھرے 'داؤجی'، 'پروفیسر دیس راج' اور 'پتاجی' کو یاد کرتے رہے ہیں مگر گذرتے وقت کے ساتھ ان کی یادوں کے زخم اس لیے بھی مندمل ہوتے گئے ہیں کہ ان کی یاد کا محور، دھرتی اور اس کی کھوکھ سے جنم لینے والی تہذیبی اقدار اور رسومات کی بجائے باکردار شخصیات رہی ہیں۔ 'توبہ افسانے' کی اشاعت سے افسانوی دنیا میں قدم رکھنے والے اشفاق احمد کی وجہ شہرت دیگر افسانوں کے علاوہ ان کا ہر دلعزیز پروگرام 'تلقین شاہ' رہا ہے۔ جوگندر پال نے 'پناہ گاہ' افسانے میں جاگیردارانہ استحصال کے مرکزی کرداروں جاگیردار، پنڈت، ساہوکار اور بنیا کے روپ میں چھپے بھیڑیوں کا مکروہ چہرہ قاری کے سامنے واضع کیا ہے۔ پنجاب کی تقسیم سے متعلق 'چھوڑا ہوا شہر' افسانے کا عنوان ہی ہجرت کے کرب کا دیباچہ ہے اور 'تروسیاں' افسانہ بھی ہجرت کے کرب پر مبنی صورتحال بیان کرتا ہے۔ 'خیال صورت' افسانہ ماضی کی جانب مراجعت کا سفر ہے جو حقیقت میں تو ممکن نہیں البتہ خیالوں میں ایسا کرنا یوں ممکن ہے کہ قاری بھی سریندر پرکاش کی طرح لائل پور کی گلیوں میں اپنا بچپن تلاش کرتا پھرے۔ ان کے افسانے 'سوکھا' کا عبدالعزیز ہاشمی نامی کردار پاکستان بننے کا زبردست حامی ہونے کے باوجود بھی پاکستان ہجرت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ 'میرا سفر اور چیچو کی ملیاں' کا آغاز جرمنی کے سفر کی یاد سے ہوتا ہے جس میں افسانہ نگار نے ادیبوں کے بطور یارانِ محفل ذکر کے بعد دوستوں سے بچھڑنے کے غم کے پسِ منظر میں تقسیم، ہجرت، پاک و ہند کشیدگی کے مکروہ اثرات وغیرہ پر ماہرانہ کمنٹری کی ہے۔ نند کشور وکرم اور دیویندر اسّر کی زندگی کا پل پل باہم اکٹھا گزرنے سے دونوں کی باہمی سوچ میں بھی یک رنگی دکھائی دیتی ہے۔ نند کشور وکرم کو بھی اپنے جنم بھومی سے شدید لگاؤ رہا ہے بلکہ وہ گزشتہ برسوں کی طرح ۲۰۱۹ء میں بھی پاکستان آئے تو راولپنڈی کے مضافات میں اپنے سابقہ گاؤں کی یاترا میں اپنے نوے سالہ دیرینہ دوست سے ملکر از حد جذباتی ہو گئے تھے۔ نند کشور وکرم کے افسانوں اور ناولوں میں بھی ہجرت کا کرب اور جنم بھومی سے عقیدت واحترام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ نند کشور وکرم کے افسانے 'ایک پاکستانی کی موت' کے ایک کردار کی دوبارہ پاکستان آنے کی خواہش دل ہی میں دم توڑ جاتی ہے اور اسے اپنے جنم بھومی میں دوبارہ آنا نصیب نہیں ہوتا۔ نند کشور وکرم کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست دیویندر اسر

کے مدوّن اور غیر مدوّن افسانوں اور ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں بھی جنم بھومی کی حسین یادوں کا کرب اور ناسٹلجیائی رنگ بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

دیویندر اسّر کا ناسٹلجیا

برّصغیر کی تقسیم سے ٹھیک ۱۹/ برس قبل ۱۴/ اگست ۱۹۸۲ء کو حسن ابدال ضلع کیمبل پور (حال اٹک) کے نامور وکیل پنڈت شری ناتھ اِسّر کے گھر پیدا ہونے والے دیویندر اسّر کا بچپن اور لڑکپن کیمبل پور میں گزرا یہیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بی اے کا امتحان دینے کے بعد عارضی طور پر کانپور ہجرت کر گئے مگر پھر آخر دم تک بھارت ہی میں رہے جہاں اک طویل عرصہ سکونت پذیری کے باوجود بھی وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح جنم بھومی کی محبت کی زنجیر میں جکڑے رہے ہیں۔ دیویندر اسّر کو جدائی کے کرب کا پہلا تجربہ پانچ سال کی عمر میں ماں کے سینے پہ سر رکھ کر سونے کے بعد ہوا جب ماں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جانے پر اسے ماں کی گود سے زبردستی الگ کیا گیا تو اس وقت نوعمری میں انھیں یہ شعور بھی نہ تھا کہ یہ ماں کی گود سے عملی زندگی کی جانب ان کی پہلی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہجرت ہے۔ اسی لیے بچپن میں ماں کی گود سے جدائی کا یہ کرب ان کے شعور و لاشعور کی تہہ میں کچھ یوں رچ بس کر رہ گیا تھا کہ زمانہ بیت جانے کے باوجود بھی وہ ماں کی یاد، دماغ کے نہاں خانوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہی نہ ہو پائے:

> "کتنا سمے بیت گیا، میں نہ اپنی ماں سے الگ ہو سکا اور نہ ہی اپنے اندر کے بچے ہی کو اپنے پیچھے چھوڑ سکا۔ اپنی ماں کی نابھی ڈور سے بندھا اپنے اندر کے بچے کو، گود میں اٹھائے کوئی کتنا لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔"(۴)

ماضی کے تصوّراتی سفر کے میں شام کے دھندلکے میں پرانی حویلی میں دیویندر اسّر کی ماں سے خیالی ملاقات سے بیٹے کی ماں سے محبت اور دیویندر اسّر کی ناسٹلجیائی سوچ کی بھرپو عکاسی ہوئی ہے۔ اس تصوّراتی ملاقات میں ماں اپنے بیٹے سے پوچھتی ہے:

> " دیو! کیسے ہو؟... تم کتنے بڑے ہو گئے ہو؟ کھانا لائی ہوں.. لو کھاؤ۔' میں نے ہاتھ بڑھایا' کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔"(۵)

دیویندر اسّر اپنے چاروں افسانوی مجموعات 'گیت اور انگارے'، 'شیشوں کا مسیحا'، 'کینوس کا صحرا' اور 'پرندے اب کیوں نہیں اڑتے' کے متعدد افسانوں کے علاوہ اپنے ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' اور غیر مدوّن افسانوں 'بیتے موسم کا مکالمہ'، 'نئی رت کا راگ' 'سدھارتھ' اور 'مسٹر روشو' وغیرہ میں بھی یادِ ماضی اور فرقتِ وطن

کے کرب کے پسِ منظر میں اپنی داستانِ حیات کی کڑیاں ملانے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ 'مسٹر روشو' افسانے کے آغاز ہی میں جب انھیں گھر میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے تو وہ ہاتھ میں چرمی بیگ لیے گھر کا دروازہ گھورتے ہوئے چپ چاپ باہر نکل آتے ہیں۔ قاری اس واقعے کو افسانہ نگار کی ذاتی داستانِ حیات کا حصہ تسلیم کرنے میں حق بجانب اس لیے بھی ہے کہ دیویندر اسّر کو بھی حقیقی زندگی میں یہی صورتحال درپیش رہی ہے۔ ان پر بھی اُسی گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا جسے وہ انتہائی عسرت کے دور میں خون پسینے کی کمائی سے تعمیر کرنے میں کامیاب رہے تھے لیکن شومیئ قسمت کہ گھر کے مکینوں نے ان سے وہاں جینے کا حق ہی چھین لیا تھا:

> "اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ ایک لمحہ اس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا رکھتے تھے کہ وہ نجانے کب ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے اور اسے دستک نہ دینی پڑے، مسٹر روشو بغیر چاپ کیے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئے۔"(۶)

بیگم کے زہر آلود گستاخانہ روّیے سے عاجز، اپنے گم گشتہ ماضی کی یادوں میں گم سم 'مسٹر روشو' کے دورانِ بارش ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے زیرِ تعمیر کیچڑ میں لت پت مکان میں داخل ہوتے ہی ماضی کے تکلیف دہ مسائل کی سرنگ منہ کھولے ان کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ یہیں پر مافوق الفطرت ہستی کے روپ میں استاد کا ظہور اور 'مسٹر روشو' کی بطور شاگرد ان سے ملاقات، دراصل دیویندر اسّر کا داستانِ ماضی کے ورتارے میں تلاشِ سکون کی جانب قدم ہے۔ اسی طرح افسانے میں 'مسٹر ونے'، سابقہ اسٹوڈنٹ 'روزنا' وغیرہ پر مبنی غیر مرئی کرداروں سے ملاقاتیں 'مسٹر روشو' افسانے کو دیویندر اسّر کو ماضی کی یاد کے سفر پر روانہ کر دیتی ہیں۔ ان کے تجریدیت پر مشتمل افسانے 'بیتے موسم کا مکالمہ' کی کہانی میں بھی 'پربلا دراے'، 'مونا' اور 'روزنا' جیسے کرداروں کے پسِ منظر میں دیویندر اسّر اپنے گزرے ماضی کے واقعات کی ورق گردانی میں مصروفِ عمل دکھائی دیے ہیں۔ نئے وطن میں بطور مہاجر کربناک صورتحال کا سامنا انھیں اس لیے بھی رہا کہ انھیں نہ صرف اپنا خاندان نئے وطن میں آباد کرنا تھا بلکہ ساتھ ہی نئی ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے اور ساکھ بنانے کے لیے بھی نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ اس سے قبل طفلانہ دور میں بھی انھیں ماں کی گود سے جدائی کے بعد پیدائشی شہر حسن ابدال کا گھر اور صحن بھی چھوڑنا پڑا تھا۔ کیمبل پور آ کر بچپن کے نئے دوستوں سے استوار تعلقات ہونے پر گلی محلے میں پروان چڑھنے والی دوستی سکول کے بعد کالج کے دور میں مزید توانا اور مضبوط ہو گئی تو لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی محبت کے رشتوں کی یہ بساط اچانک الٹ گئی اور دیویندر اسّر نے

گلی، محلہ، کھیل کے میدان، دوست، بلکہ مہربان استاد تک چھوڑ کر ہجرت کا کرب جھیلا جس کے بعد جنم بھومی کی یاد کا کرب ان کے دل و دماغ میں کچھ یوں رچ بس گیا کہ نہ تو ان کے دل سے اس مٹی سے محبت کا جذبہ مٹ سکا اور نہ ہی وقت اور فاصلوں کی وسیع خلیج، ان کے وطن سے جدائی کے زخم مندمل کر پائی:

"تم جہاں پیدا ہوئے اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو اس نگر کو اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے۔"(۷)

دیویندر اسّر کے پیدائشی شہر کیمبل پور (اٹک) سے مرزا حامد بیگ کے موصولہ خط کے جواب میں وہ اپنے، ماضی کی یاد میں غلطاں و پیچاں بچھڑے شہر کے گلی محلوں کی سیر کو جا نکلتے ہیں:

"جب میں الفاظ لکھ رہا تھا آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا شاید وہ دور ویرانے میں بھٹک رہا ہو گا۔ اسے بھی اپنے دیش سے یادوں بھرا پیارا سا پیغام ملا ہو گا جسے پڑھ کر وہ یک بارگی رو دیا ہو گا اور اتنا رویا ہو گا، اتنا برسا ہو گا کہ اپنے وطن پہنچ گیا ہو گا۔ میں رو نہیں سکتا۔ لیکن یہ الفاظ لکھ کر ایک بار اپنے وطن پہنچ گیا ہوں کیمبل پور جو ایک شہر نہیں۔ دل کی بستی کا نام ہے۔" (۸)

دیویندر اسّر عمر بھر اپنے گزشتہ ماضی کے ارمانوں کے تعاقب میں دل کی اسی بستی کی گلیوں میں جیون کے کھوئے اثاثے تلاش کرتے نظر آئے ہیں:

"یوں تو شہر میں گلیاں اور کوچے ہوتے ہیں۔ اینٹ اور پتھر کے مکان ہوتے ہیں۔ بجلی کے کھمبے ہوتے ہیں۔ کیمبل پور سے بڑے اور خوبصورت اور جاہ و جلال والے شہر موجود ہوتے ہیں، لیکن وہ گلی کہاں ہے جس میں کسی دیوار کے سائے میں چھپ کر کسی سے ملنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ وہ سڑک کہاں ہے جو لوہے اور سٹیل کی سائیکل میں بھی دل کی دھڑکن پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بجلی کا کھمبا کہاں ہے جس کے نیچے رات گئے آنکھ مچولی ہو جاتی ہے۔"(۹)

جنگی ہولناک تباہیاں کوئی بھی ذی شعور بھلائے نہیں بھول پاتا اسی لیے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ختم ہونے کے بعد جب سرحد کی دونوں اطراف کے اہلِ فکر جنگ کے نقصانات کا اندازہ لگا رہے تھے تو دیویندر اسّر کے

لیے یہ لمحہ ناقابلِ برداشت اس لیے بھی تھا کہ وہ دونوں ملکوں کے مکین رہے تھے۔ وہ نئے وطن کے نقصانات پر افسردہ ضرور تھے مگر ساتھ ہی انھیں اپنی جنم بھومی کے ہولناک جنگی نقصانات کا تخمینہ بھی لگانا تھا:

> ...''ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ریڈیو پر سنا جہاں بم گرا وہ میرا شہر تھا۔ اچانک وہ پورا شہر ایک دوشیزہ کی طرح انگڑائی لے کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تم نے کہا تھا اس مٹی کے لیے تم اپنی جان تک کی بازی لگا دو گے اور آج تم اس پر بم پھینکتے ہو۔ اور خوشی کے شادیانے بجاتے ہو کہ تم نے دشمن کا کتنا نقصان کیا... کیا ہم تمھارے دشمن ہیں۔ دیکھو دیکھو ہمارے چہرے۔ کیا یہ چہرے وہی چہرے نہیں، بچپن میں جن میں تمھارا اپنا چہرہ بھی تھا۔''(۱۰)

دیویندر اسّر نے اسطوری پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے 'پلازما کے جراثیم'، 'انسان اور انسان'، 'گیت اور انگارے'، 'میوزیم' اور 'سدھارتھ' جیسے افسانوں میں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے پر ناسٹلجیائی رنگ نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے افسانے 'انسان خلا اور موت' میں نیلماں سے معاشرے کے وڈیروں کے ظالمانہ سلوک کی داستان کے پسِ منظر میں یادِ ماضی کے علاوہ 'ننگی تصویر' کی ہیروئن کی زبانی اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہانی کے بیان کے پسِ منظر میں ماضی کی یادوں کا کرب ماورائی انداز میں پیش کیا ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کی طرح دیویندر سّر نے ماضی کی باز آفرینی کے تجربات اپنے ناول 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں بھی حال کے سٹیج پر براجمان ہو کر ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکتے ہوئے کامیابی سے پیش کیے ہیں۔ یادِ ماضی کی ماورائی پگڈنڈی پر موجود ویران حویلی سے واپسی پر ماں سے تصوراتی ملاقات کے بعد اُسی 'شیلی' نامی لڑکی کی بھی آوازیں دیویندر اسّر کی سماعت سے مسلسل ٹکراتی رہتی ہیں جس 'شیلی' کو وہ جوانی کے عالم میں بامرِ مجبوری چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھی وہی 'شیلی' ان کے دماغ کے نہاں خانوں سے باہر نکل ہی نہ پائی۔ 'شیلی' سے ہونے والی مکالمہ بازی دیویندر اسّر کے ناسٹلجیائی عکس کا منظر نامہ ہے:

> '' میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ساتھ لے لو'۔ ہاں میں نے ضد کی۔ تم نہیں مانے۔ تمھیں مجھ پہ وشواس نہیں تھا۔ شاید اپنے پر بھی نہیں، میں نے کہا تھا، تم نے زندگی دیکھی ہے مجھے نہیں۔ اور اب تم بیکار نہیں۔ سب کچھ ہے تمھارے پاس... پھر بھی تم؟ خیر... میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ جب تم پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگو گے میں ہولے سے تمھیں شال اوڑھا دوں گی۔ جب تم لکھتے لکھتے تھک جاؤ گے تو تمھاری میز پر گرم گرم کافی کا پیالہ

رکھ دوں گی اور ہاں تمھیں سردیوں میں سانس کی شکایت ہو جاتی ہے نا۔ تمھاری چھاتی پر
ہولے ہولے بام مل دوں گی... چھوڑو جو بیت گئی سو بیت گئی۔ دیکھو رات کتنی ٹھٹھری
ہوئی ہے کیسے کاٹو گے ؟ دیو!" (۱۱)

دیویندر اسّر کے ناول میں ان کے فرقتِ وطن کی یاد پر مبنی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں کیمبل پور کی چھلاٹ ندی میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی جوان حسینہ کے ساتھ نہانے کا حسین تجربہ انھیں بار بار ماضی کے جھروکوں سے صدائیں لگاتا رہتا ہے۔ ان کے متعدد کردار ماضی کے جھروکوں سے دیویندر اسّر کو اپنے ساتھ واقعاتِ زیست کی یاد کے نشے میں مدہوش رکھتے ہیں۔ الغرض اپنے ہم عصر متعدد افسانہ نگاروں کی طرح دیویندر اسّر ماضی کی حسین یاد کے کرب میں مبتلا ہو کر اپنے کرداروں کی معرفت ناسٹلجیائی عنصر کی بھرپور انداز میں عکس بندی میں کامیاب رہے ہیں۔

بحث کا اختتام ملکی تقسیم کے بعد نئے وطن میں بس جانے کے باوجود بھی فرقتِ وطن کی حسین یادوں کی بازیافت میں تڑپنے کی روایت برقرار رکھنے والے کردار کے تذکرے پر کیا جاتا ہے۔ یہ زندہ نسوانی اور حقیقی کردار ۹۰/ سالہ رِینا ورما، نامی خاتون کا ہے جو اپنی ۱۵/ سالہ لڑکپن کی عمر میں ہی پاکستان سے بھارت ہجرت کرنے کے بعد وہاں کے نئے ماحول میں گزر بسر کرنے لگی تھی مگر طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے پیدائشی شہر راولپنڈی کے کالج روڈ کی گلیاں، اپنے گھر کا چوبار بھول ہی نہ پائی۔ اور حال ہی میں ۷۵ سال بعد پاکستان آکر اپنے پیدائشی گھر اور جنم بھومی کی گلیاں گھومتے ہوئے خود کو جوان اور توانا محسوس کر رہی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ امان اللہ خان؛ محمد: اردو نظم میں ہجرت و جلاوطنی کا اظہار اور نظریہ پسِ نو آبادیات؛ مشمولہ مذاکرہ، شمارہ ۱، جلد ۲۰۲۰، ۳، اسلام آباد۔

۲۔ نند کشور وکرم: ایک دانشور کی موت؛ مشمولہ ایک دانشور، ایک مفکّر، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۔

۳۔ روبینہ الماس: اردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار؛ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۔

۴۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، نیو دھلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۔

۵۔ ایضاً: ص ۸۴

۶۔ دیویندر اسّر: مسٹر روشو؛ چہار سو، دیویندر اسّر نمبر، جلد ۵۱، شمارہ، مئی تا جون، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۔
۷۔ ایضاً: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ ایضاً، ص ۱۴۔
۸۔ ایضاً: ص ۵۰۔
۹۔ ایضاً: ص ۵۲۔
۱۰۔ ایضاً: ص ۳۱۔
۱۱۔ ایضاً: ص ۸۴۔

Roman References

1.Aman Ullah Khan, Muhammad, Urdu Nazm Mein Hijrat Awr Jalawatni Ka Izhar Awr Nazriya Pas Now Abadiyat, Mashmoola Muzakara, Issue 1 Voulm 1, Islamabad, 2020,
2.Nand Kishor Vikram,Aik Danishwar ki Mout, Mashmoola Aik Danishwar, Aik Mufakkir, Publishers and Advisors , Dehli, 2013, P.21
3. Robina Almas, Urdu Afsany Mein Jalawatni Kay Tajarby Ka Izhar, Bahaul Din Zakriya Univeristy, Multan, 2003, P.1
4.Dewandir Asar, Khushboo Ban Kay Loutein Gy, Publishers and Advertisors, Krishan Nagar, New Dehli, 1988, P.14
5. Ibid, P.84
6.Dewandir Asar, Mr Rosho, Chahar Su, Dewandir Asar Number, Volum 51, Issue May to June, Faiz Ul Islam Printing Press, Rawalpindi, 2006, P.16
7. Dewandir Asar, Khushboo Ban Kay Loutein Gy, P.14
8. Ibid, P.50
9. Ibid, P.52
10. Ibid, P.31
11. Ibid, P.82